جدیدیت پسند شبلی: تاریخ کی روشنی میں

جناب ظفر اقبال کے خط پر نقد [فرمان صدیقی]

نومبر کے شمارے میں ظفر اقبال کا عمدہ محاکمہ نظر سے گزرا۔ آپ کے حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے ظفر اقبال صاحب کا نقد شائع فرما دیا ورنہ دوسروں پر تنقید کرنے والے اپنے آپ پر تنقید برداشت نہیں کرتے۔ ظفر اقبال صاحب موجودہ حالات سے ناواقف لگتے ہیں ورنہ کبھی یہ نہ لکھتے کہ خطبات تو گرد میں چھپے ہوئے تھے۔ ساحل نے اسے عام کر دیا۔ دنیا بھر میں تمام ماڈرنسٹ خطبات سے اچھی طرح واقف ہیں اور اسلامی تاریخ میں جدیدیت کی حمایت میں انھیں معتزلہ اور خطبات کے سوا کوئی دوسرا حوالہ نہیں ملتا۔ اس وقت امریکہ کے ایجنڈے پر خطبات کو اہمیت ہے لہٰذا پرویز مشرف صاحب بھی ہر جگہ خطبات کے ذریعے سیکولر اسلام کی وکالت کر رہے ہیں۔ تمام ٹی وی چینلوں کو حکم ہے کہ وہ ہر ہفتے خطبات اقبال پر ایک پروگرام نشر کریں۔ وزیر تعلیم نے تمام وائس چانسلرز کو ہدایت کی ہے کہ وہ جامعات میں تمام سطحوں پر خطبات کو نصاب کا حصہ بنائیں اور سنت، جنت دوزخ کو خطبات کی روشنی میں مشکوک بلکہ مردود ٹھہرائیں اقبال انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل تھاٹ کو ایک ارب روپے دیے گئے ہیں جو خطبات کے ذریعے اسلام کو سیکولرائز کر رہا ہے۔ ڈاکٹر رفعت حسن اور ڈاکٹر فتحی عثمان کی کتابیں اگر ظفر اقبال صاحب کی نظر سے گزرتیں تو ان کا اعتراض رد ہو جاتا۔ بہر حال اس قدر خوبصورت تنقید پر میں ظفر اقبال صاحب کو اور اسے شائع کرنے پر ساحل کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اتنے اچھے نقاد سے ہمیں متعارف کرایا۔ اللہ کرے کہ ان کے قلم میں مزید برکت ہو۔ اگر یہ نقد شائع نہ ہوتا تو ہم اتنے اچھے مفکر اور اہل قلم سے محروم رہتے ہیں۔ ظفر اقبال کون ہیں ان کا تعارف بھی شائع کیا جائے۔ مجھے تو یہ بہت بزرگ عمر والے عالم فاضل بلکہ فاضل اجل نظر آتے ہیں ان سے استفادے کا امت کو بہت فائدہ ہو سکتا ہے۔ ظفر اقبال صاحب نے شبلی کی ذاتی زندگی کو جدید صحافت قرار دیا ہے۔ یہ نقطۂ نظر میری ناقص رائے ہیں ٹھیک نہیں، یہاں ظفر اقبال کی تنقید بہت سطحی لگتی ہے کیونکہ یہاں دلیل کا قرینہ مختلف ہے۔ حدیث کے راوی پر جس طرح جرح و تنقید کی جاتی ہے اور اس کی ذاتی زندگی بھی زیر بحث آتی ہے اس اصول کے تحت یہاں شبلی کا ذکر ہوا ہے کہ جدیدیت بڑے سے بڑے عالم کو بھی اباحیت پسند کر دیتی ہے اور اقبال جیسے مغربی تعلیم پانے والا جب جدیدیت چھوڑ دیتا ہے تو اس کی زندگی شبلی سے زیادہ پاکیزہ ہو جاتی ہے۔ ساحل نے شبلی کے بارے میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے اس احتیاط کی ضرورت نہ تھی اس میں کوئی

شبہ نہیں کہ شبلی مرحوم کو قدرت نے ذہن وفکر کی بہت اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا تھا، جن کا اظہار ان کی شاعری اور مختلف علوم وفنون کی تصنیفات...... تاریخ، سوانح، ادب، تنقید، سیرت، مذہب، سیاست وغیرہ میں ہوا ہے۔ لیکن بچپن کی شاید کسی غلط صحبت یا ماحول نے انھیں غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ محققین کا خیال تھا کہ وہ محض حسن پرست تھے لیکن جب مولانا آزاد کے ایک خط بنام حضرت نواب صدر جنگ مولانا شروانی میں لکھا گیا کہ:

في الحقيقت مولانا (شبلی) مرحوم کی ذات تنوع و کمال کے رنگ رنگ مظاهر کا ایک عجیب مجموعه تهی"

مولانا آزاد کے قلم سے یہ سطریں بھی سامنے آئیں:

شاعری کے ذوق و فهم کا جو اعلیٰ مرتبه ان کے حصے میں آیا تها، اس کی تو نظیر ملنی دشوار هے. هندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نهیں ان پر ختم هوئی تهی".

اور پھر غالب پر بھی یہ ایں الفاظ انھیں ترجیح دی ہے کہ:

"غالب جو کچھ هے تغزل، و مدح کے محدود میدانوں میں هے. لیکن مولانا (شبلی) نے فارسیت کے ذوقِ اعلیٰ کے تحفظ کے ساتھ فکر و تخیئل کے نئے نئے میدان پیدا کیے، جن پر ان کی قومی نظمیں گواه هیں".

تو اہل علم کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا تھا کہ اس میں ان کے شاعرانہ ذوق وکمال کے ساتھ ان کے ذوق حسن پرستی کا حصہ بھی تھا۔ اگر ان میں حسن پرستی کا ذوق نہ ہوتا تو ان کے کلام میں یہ حسن اور نکھار پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ اور ۱۹۰۹ء میں جب ان کا دوسرا فارسی دیوان "بوئے گل" شایع ہوا تو خود انھوں نے مولانا آزاد کو لکھا:

"میرا دوسرا دیوان بوئے گل نکلا هے لیکن بالکل پهیکا هے. سب محسوس کرتے هیں".

اس بات کو عام طور پر ان کے ذوق حسن کی ماندگی پر محمول کیا گیا تھا۔ بات ان کے مزاج اور ذوقِ حسن پرستی ہی کی نہ تھی، اس مقام سے بہت آگے کی تھی۔

حسن پرستی کو عموماً برا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ بالکل فطری ذوق اور حسن کا قدرتی تقاضا ہے کہ اسے پسند کیا جائے اور اگرچہ حسن پرستی اور عیاش طبعی یا ذہنی عیاشی میں درجوں کا فرق ہے لیکن سلامتی طبع سے اس کا فاصلہ بہت بڑھ جاتا ہے اور ذہن پر ان تراکیب کا شدید اثر ہوتا ہے، لیکن عمل کے درجے کو یہ بھی نہیں پہنچتی اور اتنی قریب ہو جاتی ہے کہ وقوعہ کے لیے صرف واردات کا پیش آجانا باقی رہ جاتا ہے۔ شبلی مرحوم کے خطوط و بیانات سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موڑ سے گزر چکے تھے۔ اگرچہ آج بھی ہم ان واقعات کو نشان زد کر سکتے ہیں کہ بمبئی، حیدر آباد، مدراس، کلکتہ میں ان کے ذوق عشق ومستی نے کیا کیا گل کھلائے تھے اور کس سے کیا معاملات پیش آئے تھے، لیکن چند خاص لوگوں سے ماضی میں بھی کوئی بات چھپی ہوئی نہ تھی۔ اور ایسا نہ تھا کہ ان پر اچانک شبلی کی سیرت کے اس پہلو کا انکشاف ہو گیا ہو۔ بلکہ خود شبلی نے انھیں اپنے حوادث عشق یا بوالہوسی کے واقعات سے واقف رکھا۔ اس

میں ان کی کوئی مجبوری نہ تھی بلکہ خود اپنے قلب کی تسکین اور حصول مسرت کے لیے انھیں قابل اعتماد سمجھ کر انھیں سناتے تھے۔ ان دوستوں میں دو اہم نام حضرت مہدی افادی اور دوسرے ابوالکلام آزاد تھے۔ مہدی افادی اور ابوالکلام سے ان کے راز و نیاز کی کوئی بات چھپی نہیں۔ دونوں ان کے اعتماد پر پورے اترے۔ کوئی بات ادھر ادھر نہیں ہوئی، ان کے ذریعے راز فاش نہیں ہوئے۔

ابوالکلام شبلی کے ذوق سے ملوث یا متہم کیے گئے۔ اور اس الزام یا اتہام کے خود انھیں کے خط میں بیان کے راوی خود شبلی تھے۔ لیکن نہ شبلی کو اس کے نقل کرنے میں تکلف ہوا اور نہ ابوالکلام نے اس بیان کی پروا کی اور پھر جب مکاتیب شبلی کے مرتب سید سلیمان ندوی نے انھیں مکتوب الیہ سے اشاعت کے لیے مانگا تو کسی تحفظ کے بغیر مولانا آزاد نے یہ خطوط سید صاحب کے حوالے کر دیے اور سید صاحب نے کسی تردد کے بغیر من وعن شایع کر دیا اور پھر جب خطوط شبلی بنام آزاد کے عکسی ایڈیشن کا منصوبہ بنایا گیا تو دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ذمے داروں نے کسی پس وپیش کے بغیر بہار اردو اکادمی پٹنہ کے سپرد کر دیا اور مرتب موصوف نے صاف دلی کے ساتھ کچھ حذف وتخفیف کیے بغیر اسے شائع کر دیا اور خطوط شبلی بنام آزاد کا عکسی ایڈیشن شایع بھی ہو گیا۔ آپ ذرا شبلی کی تحریر کی تاریخ [۱۷ر نومبر ۱۹۱۰ء] سے ۱۹۸۸ء کے اواخر میں خطوط کی عکسی اشاعت تک سلسلہ واقعات ومتعلقہ شخصیات کے رویوں پر غور فرمایے، کسی مقام پر آپ کو پانی مرتا ہوا اور کسی کی دکھتی رگ نظر آئی جس پر انگلی پڑ گئی ہو اور وہ تڑپ اٹھا ہو؟

یہ سب کچھ انجانے میں نہیں ہو گیا۔ علامہ شبلی کے قلم سے بے خیالی میں وہ جملہ نہیں نکل گیا تھا۔ ابوالکلام کے حافظے نے ان خطوط کے مطالب کو فراموش نہ کر دیا، سید صاحب نے خطوط کو پڑھے بغیر کاتب کے حوالے نہ کر دیا تھا بلکہ ایک ایک خط پڑھنے کے بعد سوانحی، تاریخی اور ادبی خصوصیات کے حامل خطوط کو چن لیا تھا اور انتخاب شایع کیا تھا۔ اور اس کے بعد ۱۹۸۸ء تک اس کے جو ایڈیشن بھی شایع ہوئے۔ ان کے متعلقین نے اپنی ذمے داریوں کو پورا کیا۔

ابوالکلام سے شبلی کے کسی ایسے تعلق کو تسلیم کرنے والے محترم ڈاکٹر وحید قریشی [مولف "شبلی کی حیات معاشقہ"] کے سوا آج تک کوئی محقق نہ ملا جس نے شبلی کے استاذ زادے مولوی خلیل الرحمان سہارن پوری کے اس اتہام کو حقیقت سمجھا ہو اور حضرت سید سلیمان ندوی سے لے کر آج تک کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس نے حضرت شبلی کی حسن پرستی اور عشق بازی کو افسانہ قرار دیا ہو؟ البتہ یہ ضرور ہے کہ حضرت سید صاحب نے اپنے انداز سے سب کچھ تسلیم کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> "صرف ایک ھی شے انسان کی حقیقی شکل و صورت کا آئینہ ھوسکتی ھے اور وہ اس کے ذاتی اور نج کے خطوط اور مکاتیب کا ذخیرہ ھے۔ چوں کہ لکھنے والے کو کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس کے یہ "پوشیدہ اعترافات" کبھی منظر عام پر آئیں گے۔ پھر بھت ایسے مکتوب الیہ ھوتے ھیں جو اس کے محرم اسرار اور عزیز دوست ھوتے ھیں، جن سے کوئی پردہ نہیں رھتا، اس لیے وہ نہایت سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنا ھر حال اور خیال بے

پس و پیش حوالۂ قلم کرتا جاتا ھے. اس لیے اس آئینے میں انسان ویسا ھی نظر آتا ھے، جیسا کہ وہ درحقیقت ھے''.

یہ بات سید صاحب نے مکاتیب شبلی [حصہ اول] کے دیباچے میں فرمائی ہے۔ گویا کہ صاف اعتراف کرلیا ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے خطوط میں جو کچھ کہا ہے وہ ان کی حقیقی شکل ہے۔

۱. ''ھاں اور سنی؟ افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لایف لکھ کر انھیں آلودہ ھاتھوں سے حیات شبلی کو چھونا چاھتے ھیں، اجازت اور حالات مانگے ھیں میں نے لکھ دیا ھے کہ ظاھری حالات تو ھر جگہ سے مل جائیں گے لیکن عالم اسرار خدا کے سوا ایک اور بھی ھے وھاں سے منگوایئے! بھئی بتا تو نہ دو گے؟''

گو کہ ابوالکلام ان کی پوشیدہ زندگی کے حالات سے واقف تھے اور ان سے حضرت شبلی کی زندگی کا کوئی راز چھپا ہوا نہ تھا۔

۲۔ مولانا آزاد نے شبلی مرحوم کو کلکتہ آنے کی دعوت دی تھی اور قیام کے لیے مٹیا برج میں کسی مکان کا انتظام کیا تھا۔ مرحوم نے جواب میں تحریر فرمایا:

''بے شبھہ میری خواھش ھے کہ چند روز دنیا سے الگ بسر کروں. ایسی حالت میں ایک تصنیف بھی انجام پائے، لیکن متصل دن رات تو وحشت کدے میں بسر نھیں ھوسکتی. شیعوں کے عملی فلسفے کی کوئی صورت پیدا ھو تو البتہ ممکن ھے!''

[مکاتیب شبلی، مکتوب نمبر ۵، مورخہ ۵/دسمبر ۱۹۰۹ء]

بھلا دنیا اسے کیا کہے گی؟ حسن پرستی، عیاش طبعی یا ذہنی عیاشی .... یہ حسن پرستی تو بہر حال نہیں اور ذہن وطبع کی سطح سے بھی اونچے درجے کی چیز ہے۔ چوں کہ خواہش نے وقوعے کی شکل اختیار نہیں کی اس لیے شبلی تعزیز کے سزاوار نہیں ٹھہرتے لیکن سزا تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی ہونی چاہیے!

۳۔ ابوالکلام سے شبلی کے بڑے رازو نیاز تھے۔ شبلی و آزاد کی مراسلت میں کسی ''بدر کامل'' کے غروب ہو جانے کا ذکر ہے۔ ابوالکلام نے ان سے پرزور تعزیت بھی کی، لیکن حقیقت واشگاف نہیں ہوئی، نہ پردہ ہٹا نہ چہرہ نظر آیا۔ شبلی لکھتے ہیں:

ماسٹر دین محمد وطن گئے تھے. سخت جاں گداز خبر لائے. یعنی بدر کامل حیدر آباد سے دھلی پھنچ کر غروب ھوگیا، مرتبہ ابراھیمی کھاں سے ھاتھ آئے کہ لا احب الافلین کھہ سکوں!''

اس کے جواب میں ابوالکلام کو بھی دیکھ لیجیے کیا فرماتے ہیں:

''ماسٹر دین محمد نہایت وحشت ناک خبر لائے! میں واردات مسرت ونشاط میں شریک نہ تھا، مگر اجازت دیجیے کہ ماتم میں بہ قدر استعداد دست وسینہ حصہ لوں............''

شبلی مرحوم کا خط ۱۵؍اکتوبر کا اور اس کا جواب مولانا ابوالکلام کے قلم سے ۲۰؍اکتوبر ۱۹۱۰ء ہے۔ یہ کیا حادثہ گزرا تھا کہ ایک ۵۳ سالہ بزرگ ماتم کناں ہے کہ وہ مرتبہ ابراہیمی پانے سے محروم رہ گیا اور ۲۳ سالہ نوجوان ہے جو بہ قدرِ استعداد دست و سینہ ان کا شریک ماتم بننا چاہتا ہے؟

اسی خط میں شبلی لکھتے ہیں:

"الہ آباد کی نمایش میں ایک اور اضافہ ہوا یعنی دیوان فیضی بھی ہوگا اور وہ اوائل دسمبر میں پہنچ جائے گا. میرے پاس اطلاع آچکی ہے. افسوس! اس زمانے میں میاں اسحاق کا کتب خانہ معمور ہوگا. ورنہ ممکن تھا کہ زیادہ مطالعے کا موقع ملتا".

جواب میں ابوالکلام لکھتے ہیں:

"اس زمانے کی خیرہ مذاقی دیکھیے کہ دیوانِ فیضی کا اولین مستحق تو کتب خانہ ندوہ تھا کہ ان چیزوں کا موجودہ عہد میں آپ کے سوا کوئی اور ٹھکانہ ہے نہیں! گورنمنٹ لائبریری الہ آباد میں اس کے دقائق و محاسن کو سمجھنے والا کون ہے؟ اور یوں ورق گردانی اور عنوان ہائے جلی کو نافہمانہ دیکھ لینا دوسری بات ہے. الہ آباد کی نمایش بازارِ مصر سے تو کسی طرح فایق نہیں، لیکن جب اس کی نسبت اردو کے ملکہ التجار نے صاف کہہ دیا کہ

خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

تو پھر نمایش کے خریداروں کی حقیقت معلوم البتہ اس واژوں روشنی کی حمایت میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ مقصود بیع و شرا نہیں، بلکہ صرف نمایش، لیکن شاید جناب کو اس پر بھی اعتراض ہو"

[بحوالہ مذکورہ بالا خط]

ایک صاحب یہ پڑھ کر بے چین ہوگئے کہ گورنمنٹ لائبریری الہ آباد کو خط لکھنا چاہیے اور دیوان فیضی کے مخطوطے کی نقل حاصل کر کے اسے ایڈٹ کرنا چاہیے۔ اس عہد میں دیوان فیضی کے مخطوطے سے بڑھ کر تحقیق کے لیے کوئی اور موضوع اور کوئی دیگر مخطوطہ نہیں ہوسکتا! حال آں کہ 'دیوان فیضی' سے مراد واقعتاً دیوان کا مخطوطہ نہیں، عطیہ فیضی کے لیے استعارہ ہے اور کیا خوب استعارہ ہے۔ عطیہ الہ آباد کی نمایش دیکھنے آرہی تھیں۔ شبلی کو ان سے تعلق خاطر تھا۔ ابوالکلام ان کے اس راز سے واقف تھے۔ شبلی کو ان پر اعتماد بھی تھا۔ انہی کو یہ خوش خبری سناتے ہیں اور انھیں الہ آباد کے سفر کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ اسحاق شبلی کے چھوٹے بھائی الہ آباد میں مقیم تھے اور ہائی کورٹ کے وکیل تھے۔ شبلی انہی کے گھر عطیہ کو ٹھہرانا چاہتے تھے۔ لیکن بے چینی یہ تھی کہ گھر کے ماحول میں زیادہ خلوت میسر

نہ آسکتی تھی اور نہ شوق کی فراوانی کی حد تک لطف صحبت اٹھا سکتے تھے۔

''دیوان فیضی''، اگر کوئی مخطوطہ ہوتا تو وہ نمایش کے کسی شوکیس کی زینت ہوتا۔ مطالعے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ صرف زیارت ہو سکتی تھی۔ میاں اسحاق کے گھر کے معمور ہونے کا افسوس اور ''زیادہ مطالعے کا موقع'' نہ ہونے کا رنج اسی لیے تھا۔ ابوالکلام کے جواب نے اس حقیقت کو اور واضح کر دیا۔ ذرا غور کیجیے تو شبلی کے ذوق و سیرت کی پوری تصویر نظروں میں گھوم جاتی ہے۔

کتب خانۂ ندوہ کا اشارہ شبلی کے عشرت کدے کے لیے ہے۔ جیسے کہ میاں اسحاق کے کتب خانے سے مراد خود شبلی نے ان کا گھر اور کاشانہ مراد لیا ہے۔

شبلی کی زندگی کے بارے میں جو کچھ سامنے آیا، وہ ٹھیک اسی اصول کے مطابق ہے جو حضرت سید سلیمان ندوی صاحب نے مکاتیب شبلی کے دیباچے میں خطوط کے انتخاب میں اخلاقی معیار کے طور پر پسند کیا تھا اور محققین نے حضرت شبلی کی حسن پرستی کے ذکر میں جن چند چیزوں پر بحث کی وہ شبلی کے انھیں ۴۰ خطوط سے اخذ کیں جو خود حضرت سید صاحب نے شبلی کے تقریباً ۶۰ خطوط سے اپنے مرتبہ مکاتیب شبلی کے لیے منتخب کیے تھے۔

لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ جو چیز سید صاحب نے خطوط میں انتخاب کے لیے بہ طور ایک معیار کے پسند کی تھی، حیات شبلی میں اس کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا [غالباً اس لئے ماجد دریا آبادی نے رقعات ماجدی میں حیات شبلی کو سلیمان ندوی کی کمزور ترین کتاب کہا ہے] یہاں ہم صرف دو مثالیں پیش کریں گے۔

۱۔ حضرت سید صاحب نے شبلی مرحوم کے عقد ثانی (۱۹۰۰ء) کے واقعے کا ذکر کیا ہے [حیات شبلی، صفحہ ۵۰-۳۴۸] لیکن تفصیل واقعہ نکاح کی نہیں۔ علامہ شبلی کے بیٹے محمد حامد کی ناراضگی اور ان کے گھر سے فرار ہو جانے دنیا ترک کر دینے، ایک بزرگ کے مرید بن جانے، گیروا لباس اختیار کر لینے اور کئی مہینے کے بعد گھر واپس آنے اور پھر واپس چلے جانے کے عزم کی ہے۔ بیٹا باپ کے ایک فیصلے سے متفق نہ تھا اور ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا تھا، تو کوئی حیرت کی بات نہ تھی۔ محض اس واقعے کی اتنی اہمیت نہ تھی کہ حیاتِ شبلی کے پورے دو صفحے سیاہ کر دیے جائیں۔ اس میں اہمیت بیٹے کی وجہ ناراضگی کی تھی اور اسی کے بارے میں سید صاحب علیہ الرحمہ نے جملہ تو کیا ایک لفظ نہ لکھا۔ اس سلسلے میں شبلی نے کسی صاحب کو ایک خط لکھا تھا۔ اس کو مکاتیب شبلی میں درج نہیں کیا۔ شاید اس سے ناراضگی اور گھر سے فرار کے سبب پر کوئی روشنی پڑتی لیکن سید صاحب نے اس سے استفادے کا موقع نہیں دیا۔ حالاں کہ شبلی کے سوانح اور سیرت کا یہ ایک اہم واقعہ تھا اور حضرت سید صاحب نے خطوط کے انتخاب کے لیے جو معیار مقرر کیا تھا اس پر پورا اترتا تھا اور نہ حیات شبلی ہی میں محمد حامد کی ناراضگی اور فرار کی وجہ پر روشنی ڈالی۔

ہمارے معاشرے میں عام طور پر یہ بات پسند نہیں کی جاتی کہ اولاد جوان ہو جائے تو بیوہ ماں یا باپ دوسرا نکاح کریں۔ اس بارے میں خاندان کے افراد میں بعض اوقات اختلافات بھی ہوتے ہیں اور رنجشیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لیے اگر علامہ شبلی کا بیٹا بھی باپ کے نکاح ثانی کے فیصلے سے متفق نہیں تھا اور ناراض ہو کر گھر سے نکل گیا تھا تو کوئی تعجب انگیز بات نہ تھی۔ لیکن بات صرف اتنی ہی تو نہ تھی۔ اگر ابوالکلام اس واقعے کے پس منظر سے واقف ہو سکتے تھے تو حضرت سید صاحب تو شبلی مرحوم سے شاگردانہ تعلق اور قرب و صحبت کے زیادہ مواقع حاصل

ہونے کی وجہ سے نیز ان کے سوانح نگار کی حیثیت سے ان کے حالات کے جویا ہونے کے راستے سے ابوالکلام سے بہت زیادہ واقف ہوتے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ حضرت سید صاحب حامد کی ناراضگی اور گھر سے فرار کی اصل وجہ سے ضرور اور بہ خوبی واقف تھے۔ اس کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ محمد حامد کا خط جس میں انھوں نے اپنی ناراضگی اور گھر چھوڑ دینے کے بارے میں لکھا تھا۔ سید صاحب کی نظر سے گزرا تھا اور اس کا ایک اقتباس انھوں نے حیات شبلی میں دیا ہے۔ اگر ابوالکلام شبلی کی ملاقات سے چار پانچ سال پہلے پیش آنے والے واقعے سے واقف تھے تو وہ پہلے شخص نہیں تھے جو اس راز سے واقف تھے۔ یہ بات ایسی نہیں تھی جو شبلی مرحوم نے انھیں بتائی ہو۔ یہ بات سید صاحب نے بھی انھیں نہیں بتائی ہوگی۔ یہ بات کسی اور نے انھیں بتائی ہوں گی اور وہ شخص بھی اس راز کا تنہا واقف نہیں ہوسکتا۔ ۱۹۰۹ء کے بعد جو حالات علامہ شبلی مرحوم کے خلاف جمع ہونے لگے تھے اور ۱۹۱۳ء میں جو ہنگامہ برپا ہوا تھا، اس کی بیشتر تفصیلات پر خطوط شبلی سے روشنی پڑتی ہے۔ حضرت سید صاحب نے بھی حیات شبلی میں ان پر روشنی ڈالی ہے۔ شبلی مرحوم کو ندوہ سے بے دخل کرنے کی جو سازش پرورش پارہی تھی، جس کی شکایت خود شبلی نے کی ہے۔ ذرا شبلی کے اس شکوے کو سنئے اور اس روشنی میں حالات کی سنگینی کا اندازہ کیجیے۔ شبلی لکھتے ہیں:

۱۔ "اب کی مولوی خلیل الرحمن وغیرہ نے جلسہ انتظامیہ میں میری علاحدگی کی تجویز پیش کی. اس لیے کہ جب سے میں ندوہ میں آیا، لوگوں کی توجہ کم ہوگئی اور ندوے کو نقصان پہنچ رہا ہے. کیوں، آپ بھی اس رائے سے متفق ہیں یا نہیں!" [مکاتیب شبلی، ص ۲۶۴]

شبلی کا یہ خط ۹/جون ۱۹۰۹ء کا ہے۔ اس وقت حالات یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ جلسۂ انتظامیہ میں یہ تجویز پیش ہوچکی تھی۔ اگر جون ۱۹۰۹ء تک حالات اتنے بگڑ چکے تھے تو اندازہ کیجیے کہ فساد کا آغاز کب ہوا ہوگا۔ ہمارے خیال میں اس وقت سے جب شبلی نے ۱۹۰۵ء میں لکھنو پہنچ کر اپنا عہدہ سنبھالا ہوگا۔ یہ حقیقت ہے لیکن ہمارے لیے اس کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں۔

۲۔ جون ۱۹۰۹ء میں حالات کی اس منزل سے ڈیڑھ برس کی مسافت سفر کے بعد کے حالات پر نظر ڈالیے۔ مرحوم علامہ شبلی ۱۷/نومبر ۱۹۱۰ء کے مکتوب بہ نام ابوالکلام میں لکھتے ہیں:

"آج کل سخت نرغہ ہے. سہارن پوری، شاہ جہاں پوری، پھلواروی، کاکوروی سب یک جا جمع ہیں. رپورٹیں تیار ہو رہی ہیں، مضامین لکھے جا رہے ہیں، فرد قرارداد جرم مرتب ہو رہی ہے، بلکہ مرتب ہوچکی ہے. اقرار نامہ عقائد تیار ہو گیا ہے جس کا مجھ سے اقرار کرایا جائے گا اور ان سب کاموں کے چیف ایڈیٹر جناب شاہ صاحب ہیں، جناب موصوف نے یہاں مستقل قیام اختیار کیا ہے. یہ تمام کاغذات ارکان کے پاس بھیجے جائیں گے اور باضابطہ میرے نکالنے کی تحریک کی جائے گی". [ایضاً: ۲۷۴-۷۵]

علامہ شبلی کے خلاف جو فرد جرم تیار کی گئی تھی۔ ہمارے سامنے نہیں لیکن خطوط شبلی کی روشنی میں ہم اب بھی تیار کر سکتے ہیں۔ اس فہرست میں سب سے بڑا جرم ان کا یہ تھا کہ ان کی صحبتوں میں طلبہ بگڑ رہے تھے۔ مخالفین کا کہنا یہ تھا کہ ندوہ کی بقاء حیات کے اعمال ضرور انجام دیے جائیں، لیکن معصیت کے اس فساد کو تو روکا جائے، اور ان کا کہنا یہ تھا کہ اس کے لیے ضروری ہے کہ شبلی کو نکالا جائے۔ وہ ندوہ کی بقا کے لیے شبلی کو ناگزیر نہیں سمجھتے تھے۔ شبلی اپنے اوپر الزامات کا نہ جواب دیتے تھے نہ بحث چھیڑنا چاہتے تھے۔ وہ ابوالکلام کو ایک خاص نکتے سے بحث کو پھیلانے سے روکتے تھے۔ ابوالکلام کا شبلی پر یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے شبلی کے خلاف تحریک کو ندوے کی بقاء و حیات کی جنگ بنا دیا تھا اور اسی پر جنگ کا خاتمہ ہوا، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ ختم ہو گئی لیکن مخالفین کی بے چینیاں اور ریشہ دوانیاں ختم نہ ہوئیں۔ اللہ کا شبلی پر بڑا رحم یہ ہوا کہ وقت موعود آپہنچا اور اس جھگڑے سے شبلی کی جان چھوٹی۔ اگر شبلی زندہ رہتے اور ندوے سے ان کا تعلق برقرار رہتا تو جو فساد ندوے کی بقاو حیات کی جنگ میں دب گیا وہ وہ بعد میں کسی وقت بھی پھوٹ پڑتا۔

۱۔ شبلی نے اپنے خلاف کسی اخلاقی الزام کی کہیں تردید کی اور اپنی صفائی میں کہیں کچھ لکھا؟ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی صفائی میں نہ کچھ لکھا اور نہ کچھ کہا۔ اس لیے کہ ان میں اس کی ہمت ہی نہ تھی۔

۲۔ اور یہ کہ ''حضرت سید سلیمان صاحب کی اپنے فاضل، نامور اور قابل فخر استاد سے یہ کیسی محبت تھی کہ اپنے استاد کے خلاف تین ساڑھے تین سال کی کشمکش کے دوران استاد کی حمایت اور ان کی صفائی میں ایک لفظ نہیں لکھا اور جب وہ حیات شبلی میں ندوے میں کشمکش اور ندوے کے بقاو حیات کی تاریخ مرتب کر رہے تھے تو ساڑھے آٹھ صفحوں میں پھیلی ہوئی تاریخ میں کہیں یہ جملہ نظر آیا کہ شبلی ان اتہامات سے پاک تھے جو ان پر لگائے گئے اور یہ ساری غلطی مولوی خلیل الرحمٰن کی شبلی سے حسد اور ذاتی رنجش کا شاخسانہ تھی!

۳۔ یا شبلی نے جن سہارن پوری، شاہ جہان پوری، پھلواری، کاکوروی صاحبان کو اپنے مخالفین کا جتھہ بنایا تھا اور ایک شاہ صاحب کو ان کا سرغنہ بتایا تھا جو اس جنگ کی رہنمائی کے لئے الہ آباد سے ہجرت کر کے لکھنو آبیٹھے تھے ان میں کسی کے بارے میں کہیں ایک جملہ لکھا کہ شبلی کی مخالفت میں کس کا کیا کردار رہا تھا؟

۴۔ پھر حضرت سید صاحب کی یہ کیسی دوستی اور دشمنی ہے کہ نہ دوست کی حمایت ہے نہ دشمن کی مذمت اور سیرت کی یہ کون سی خوبی ہے کہ انھوں نے فسادیوں، امن پسندوں اور گناہ گاروں اور بے گناہوں میں سے اس فساد میں کس کا کتنا حصہ ہے۔ سید صاحب نے تو سب کو ایک ہی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ فرشتہ کون ہے اور شیطان کون؟

اسی طرح شبلی سے ان کے بیٹے کی رنجش کے تذکرے میں سید صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اس معاملے میں قصوروار کون تھا اگر سید صاحب یہ بتا دیتے کہ وہ رشتہ پہلے انکے بیٹے کے لئے طے ہوا تھا اور باپ نے اسے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا خواہ اس میں خود باپ کے ایما کو دخل ہوتا یا اس میں لڑکی کے خاندان والوں کی تحریک شامل ہوتی کہ ان کے لیے شبلی کے مجہول بیٹے کے بجائے شبلی سے دامادی کا رشتہ قایم کرنے میں فخر تھا۔ کوئی صورت حال پیش آئی ہوتی خواہ سوسایٹی میں اس واقعے پر انگلیاں اٹھائی جائیں۔ لیکن اس میں شرعی، قانونی اور اخلاقی کوئی معصیت نہ تھی۔ حضرت سید صاحب سے بہتر اس مقدمے کی پیروی اور کوئی نہ کر سکتا تھا!

ساحل دسمبر ۲۰۰۶ء

دوسرا واقعہ جس کا سبب یا پس منظر جاننے کے لیے لوگ آج تک بے چین ہیں۔علامہ شبلی کے گزند پا کا واقعہ ہے! چوں کہ مرحوم کی سیرت کے بارے میں بعض باتیں مشہور ہو چکی ہیں اس لئے کوئی عام اور سادہ سا سبب تسلیم کر لینے پر کسی کی طبیعت کبھی آمادہ نہیں ہوئی کیا اس سانچے میں بھی کہیں ان کے ذوق حسن پرستی یا جنسی ہوس کی کارفرمائی تو نہیں؟ اور یہ سوچ کر ہم اپنے دل کو تسکین نہیں دے سکتے کہ اس واقعے پر پوری ایک صدی گزر چکی ہے اب تو سر رشتہ تحقیق ہمارے ہاتھ میں نہیں اور اب اس تحقیق کا کوئی علمی، ادبی تاریخی فایدہ نہیں۔اب اگر خاموش ہو جانے کو ہمارا جی نہیں چاہتا اور ہم اپنے دل سے اسے نکال دینے پر قادر نہیں تو اس واقعے ہی پر غور فرما لیجیے اس کی تفصیل بیان کرنے والے شبلی ہیں یا بعض باتیں سید سلیمان ندوی نے بیان فرمائی ہیں۔

شبلی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے:

یہ ۱۷/مئی ۱۹۰۷ء کا واقعہ ہے. شبلی دفتر سے اٹھ کر زنانہ کمرے میں گئے. ایک بچھے ہوئے تخت پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے. تخت پر بھری ہوئی بندوق رکھی تھی شبلی نے اٹھا کر ایک دوسرے شخص کے ھاتھ میں دے دی اتفاق سے گھوڑا گر گیا. اور گولی چل گئی. نال ان کے ٹخنے سے ایک فٹ کے فاصلے پر تھی. شبلی کی ایڑی پر گولی لگی اور ٹخنے سے نیچے کا حصہ جوتے میں رہ گیا. حادثے کے وقت ایک دوسرے شخص کے سوا گھر میں کوئی نہ تھا. فایر ھوا تو آواز سن کر باھر سے بعض آدمی اندر آگئے. ٹخنے سے نیچے کا پاؤں جوتے ھی میں رہ گیا ڈاکٹر آیا تو اس نے دیکھا کہ پنڈلی تک ھڈیاں چٹخ چکی ھیں. چنانچہ نصف پنڈلی تک پاؤں کاٹ کر پٹی باندہ دی گئی شبلی کے الفاظ میں چوں کہ ھڈیاں کچھ اوپر تک پھٹ گئی تھیں اس لئے نصف پنڈلی جدا کر دی گئی.

علامہ شبلی نے اسی بیان میں یہ بھی بتایا ہے کہ کارتوس میں بڑے چھرے تھے۔

حضرت سید سلیمان ندوی نے واقعے کا پس منظر موقع کی نقشہ کشی اس طرح کی ہے:

"اس زمانے میں شعر العجم جلد اول کے اوراق زیر تصنیف تھے. سترہ مئی ۱۹۰۷ء کی صبح کو دس بجے وہ بستر سے اٹھ کر ھال میں تشریف لے گئے جو ان دنوں زنان خانے میں شامل تھا. یہاں تخت بچھے ہوئے تھے. یھیں مولانا ایک پائوں لٹکا کر ایک تخت پر بیٹھ گئے. اسی بنگلے میں باغ بھی تھا جس میں لیچیاں لگی ھوئی تھیں اور کوے آ کر ان کو نقصان پھنچاتے تھے. مولانا کے اکلوتے صاحب زادے حامد صاحب نے ان کے اڑانے کے لئے بندوق میں چھروں کے کارتوس بھر کر رکھے تھے. اور اس کو ھال ھی میں چھوڑ گئے تھے. مولانا نے اسی بندوق کو اپنے ھاتھ سے اٹھایا تو بھت وزنی معلوم ھوئی پاس ھی مقابل میں ان کے پیچھے یعنی حامد صاحب کی بیوی بیٹھی ھوئی تھیں ان کو یہ کھہ کر دی کہ یہ عورتوں سے تو اٹھ بھی نھیں سکتی. اس دینے لینے میں ھاتھ بندوق کے گھوڑے پر پڑ گیا اور بندوق فائر ھو گئی جس کا نشانہ مولانا کا پائوں

(قدم) تھا. گھر میں کھرام برپا ہو گیا. لیکن مولانا کو کچھ احساس نہیں ہوا اتنا معلوم ہوا کہ پاوں میں جھٹکا لگا وہ دوسروں سے پوچھتے تھے کیا ہوا خیر ہے؟

سید صاحب نے حادثے کی یہ تفصیلات ایک مضمون میں لکھ کر اخبارات کو بھیج دی تھیں اور الندوہ میں چھاپ دی تھیں یہ واقعہ گزر گیا اور اپنے پیچھے لوگوں میں خیال آرائیوں کا ایک سیلاب چھوڑ گیا۔ عوام کو اس حادثے سے دل چسپی نہ تھی لیکن خواص کی خیال آرائیوں سے بدگمانیوں ہی کا حصہ تھا سید صاحب نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ دوسرا شخص جسے شبلی نے بندوق دی تھی وہ ان کی بہو تھی اس انکشاف نے قیاس آرائیوں کا دروازہ کھول دیا تھا۔ چند اور باتوں نے ان کے خیالات کو مہمیز لگائی تھی۔

شبلی کا ذوق حسن پرستی، عطیہ سے دل چسپی نے دستہ گل کی شاعری میں رنگ بھرا تھا۔ حامد (بیٹے) کی منگیتر سے چند سال پہلے انھوں نے خود شادی کر لی تھی اور بیٹا ناراض ہو کر گھر سے نکل گیا تھا۔ خواص کے علم میں یہ واقعہ تازہ تھا۔ اب دو سال پہلے اس کے انتقال کے بعد وہ پھر رنڈوے ہو گئے۔ ان واقعات کی اس وقت تک اتنی شہرت نہ ہوگی لیکن خواص جن میں ان کے مخلصین ہی نہیں نکتہ چین اور مخالفین بھی ہوں گے ان حالات سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے۔ اور ایک بوالہوس اور جنس کا مارا کچھ بھی کر سکتا ہے اور اس بات نے اس وقت گھر میں اسی عفیفہ کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ لوگ فایر کی آواز سن کر گھر میں آئے تھے اس بیان نے بھی شکوک پیدا کیے کہ بندوق کے کارتوس میں بڑے چھرے تھے جو جانوروں کے شکار کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور بڑا چھرہ جو انسان کے پیر (قدم) کو اڑا دے اور پنڈلی تک ہڈی کو پھاڑ دے اس سے تو ہرن اور نیل گائے تک کو شکار کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات کہ بندوق لیچیوں کو نقصان پہنچانے والے پرندوں کو اڑانے کے استعمال کے لئے تھی تعجب انگیز ہے اول تو درختوں اور باغوں سے کوے اڑانے کے لئے بندوق استعمال نہیں کی جاتی پرندے اڑانے کے لیے آواز پیدا کی جاتی ہے جو جو بارود کے کارتوس سے پیدا کی جاتی ہے، اور کافی ہو سکتی ہے۔ پھر وہ بھی کسی کوٹھی کے پائیں باغ میں چند درختوں کے پھلوں کی حفاظت کے لئے اور اگر وہ ایسا کرتے تو یہ عمل دن میں کئی بار دہرایا جاتا ہوگا اور جہاں یہ بات روزمرہ کے معمول میں شامل ہو وہاں فایر کی آواز پر کوئی توجہ بھی نہ دیتا ہوگا۔...... فایر کی آواز سن کر لوگوں کا گھر میں گھس آنا اور بہ قول سید صاحب کے کہرام مچ جانا تعجب انگیز اور نا قابل یقین ہے پھر بندوق ایسا ہتھیار کبھی نہیں رہا کہ وہ گھروں میں ادھر اُدھر پڑا ہوتا ہو اور لوڈ بھی ہوتا اور کوئی بے پروا بھی ہو کہ اسے لاک بھی نہ کرے۔ اور اگر ایسا ہو تو اس پر ڈانٹنے کا محل تھا نہ کہ اس مکالمے کا کہ یہ عورتوں سے تو اٹھ بھی نہیں سکتی۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں جن کا جواب سید صاحب کے پاس بھی نہ تھا۔

بہت سے واقفین ان باتوں کو وقت گزرنے کے ساتھ فراموش بھی کر چکے ہوتے اور نئے لوگوں کے خیال میں بھی یہ باتیں نہ آتیں لیکن ۱۹۴۳ء میں حیات شبلی کی اشاعت کے بعد سید صاحب کا بیان صفائی پڑھ کر نوجوان محققین سوچنے لگے کہ اس معاملے کی حقیقت کیا ہے؟ شیخ اکرام کو حیات شبلی کی اشاعت کے بعد توجہ ہوئی اور دیگر حضرات نے بھی شبلی مرحوم پر ایک خاص انداز سے اسی وقت سوچا اور اس کے بعد ہی ڈاکٹر وحید قریشی کو توجہ ہوئی۔